© rasailojaraid.com

تعلیم کا تہذیبی نظریہ اور ہم

جناب نعیم صدیقی صاحب

تعلیم کیا ہے؟

وہ عمل جس کے ذریعے ایک نسل اپنی حاصل کردہ معلومات، تجربات، عملی مہارتوں اور اپنے عقیدہ و اطوار کو نوخیز نسل کی طرف منتقل کرتی ہے۔

پہلے اس عمل کا زیادہ تر حصہ گھروں کے دائروں میں تکمیل پاتا تھا، ماں کی گود اور باپ کے فیضانِ نظر کا مکتب اکتفا کرتا تھا۔ پھر یہ عمل قبیلے یا دیہی کمیونٹی تک وسیع ہو گیا۔ بعد میں جب انسانی معلومات اور تجربات کا پھیلاؤ بڑھ گیا تو باقاعدہ مکتب و مدرسہ کے ادارے وجود میں آگئے۔ اور اب جب کہ شاخ در شاخ علوم کی پہنائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر شاخ بجائے خود چمن بداماں ہے، تعلیم کا عمل یونیورسٹیوں اور جامعات و کلیات کے بھاری بھرکم نظام کا منت کش ہو گیا ہے۔

زمانہ کوئی بھی ہو، معاشرہ کسی بھی سطح کا ہو، تعلیم کے دائرے کا پھیلاؤ کم ہو یا زیادہ، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ذہن، جسم، ماحول اور اشیاء کے متعلق معلومات و تجربات کے انبار کو بھلے بُرے، مفید و مضر اور صحیح اور غیر صحیح کی چھنٹائی کئے بغیر ایک زمانے کے لوگ اپنے اخلاف کے حوالے کر دیں۔ بلکہ اس فطری تقاضے کے تحت جس کے اثر سے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان کی کج فکریوں، غلطیوں اور کمزوریوں سے بچ کر زیادہ بہتر انسان ثابت ہوں، تعلیم کے عمل میں یہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ناقص معلومات و تجربات، حقائق کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے غلط تصورات اور انسانی اطوار کے ناپسندیدہ اجزاء کو چھانٹ کر بہترین مواد کو آئندہ نسلوں کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح ہر نسل یا ہر دور کی طرف سے کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ صرف اس سرمایۂ علم کی آگے ترسیل کی جائے جو زیادہ سے زیادہ قرینِ حقیقت اور ذریعۂ افادیت ہو۔ ورنہ اگر سارے رطب و یابس کو اکٹھا کر کے شروع سے منتقل کیا جاتا تو آج ہر طالب علم کے سامنے نصابیات کا پورا ایک انبارِ خر ہوتا اور کسی استاد کا دماغ تدریسی مواد کا گودام بننے کے قابل نہ ہوتا۔

تعلیمی عمل کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ معلومات و تجربات کو متفرق اور پراگندہ صورت میں منتقل نہیں کیا جاتا، بلکہ سارے مواد کو ایک خاص ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترتیب جس مرکز کے گرد واقع ہوتی ہے وہ کسی معاشرے کے عقیدے، مقصد اور انسانِ مطلوب کے تصوّر سے بنتا ہے۔ یہی تین چیزیں اس کسوٹی کی تشکیل بھی کرتی ہیں جس سے تعلیمی مواد کو پرکھ کر خس و خاشاک کو الگ کیا جاتا ہے اور ذراتِ زر اور پارۂ ہائے جواہر کو اگلی نسلوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔

دنیا میں کبھی کوئی نظامِ تعلیم ایسا نہیں پایا گیا جو کائنات و حیات کے متعلق کچھ اساسی معتقدات نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح ہر قوم کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصدِ وجود ہوتا ہے ۔۔۔ خواہ وہ لوٹ مار ہو یا نوعِ انسانی کی خدمت۔ اور ان دو بنیادی حقیقتوں کا لازمہ انسانِ مطلوب کا ایک تصور ہے۔ ہر معاشرہ اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے ساری معلومات اور سارے تجربات کو نہ صرف اپنے اس بنیادی سرمایۂ شعور کے گرد مرتب کرتا ہے، بلکہ وہ اس بنیادی سرمایۂ شعور کو تعلیمی عمل میں بنیادی اہمیت دیتا ہے۔

اسی بنیادی سرمایۂ شعور سے ہر معاشرے کا کلچر بنتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی ساری تہذیب تشکیل پاتی ہے۔ اس کلچر یا تہذیب کو تعلیم کے ذریعے ہر نسل دوسری نسل کی طرف بڑی احتیاط اور بڑی سرگرمی سے منتقل کرتی ہے۔ اسی تہذیب کے مطابق اس کی اجتماعیت بنتی ہے، اسی کے مطابق اس کا نیشنل ٹائپ بنتا ہے، اسی کے مطابق اس کا نظامِ اقدار، اس کا سلسلۂ اطوار اور اس کا تصوّرِ کردار نمودار ہوتا ہے۔ پس اگر وہ اپنے امتیازی تہذیبی شعور کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے میں کوتاہی کرے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اخلاف اپنے تہذیبی وجود کو کھو بیٹھیں۔ اپنا مقصد گم کر دیں، اپنے تصوّرِ کردار سے محروم ہو جائیں، اپنے معتقدات کی عمل انگیز روح کو ضائع کر دیں، اور اپنی اجتماعیت کی شکست و ریخت کا تماشا کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس میں جس تہذیبی نظریۂ تعلیم پر گفتگو کر رہا ہوں، اس کے لحاظ سے اوّلیت اس امر کو حاصل ہے کہ پورے نظامِ تعلیم میں اس تہذیبی شعور اور تجربے کو اوّلیت اور غلبہ حاصل ہونا چاہیے جس کے بل پر کوئی قوم قائم ہے اور جس کی تحریک ہی سے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر مزاحم قوتوں کے ہر چیلنج کا جواب دینے کے قابل ہوتی ہے۔

تہذیبی نظریۂ تعلیم پر غور کرتے ہوئے ہمیں خود اپنے بارے میں سوچنا چاہیے کہ ہمارا امتیازی تہذیبی وجود کیا ہے، کیسے بنتا ہے اور اس کی بنا کیا ہے؟

کائنات و حیات کی حقیقت سے لے کر تاریخ کے قانونِ عروج و زوال تک انسان نے مختلف اَدوار میں جو فلسفیانہ افکار سمیٹے ہیں، وہ حواس و قیاس کی دی ہوئی محدود معلومات پر مبنی ہیں۔ یہ معلومات نت بدلتی ہیں، غلط ثابت ہوتی ہیں، اس وجہ سے یہ گمان تو دے سکتی ہیں، ایمان نہیں دے سکتیں۔ دُنیا کی بہت سی مذہبی اور عقلی قوموں نے گمان پر ضروری عقیدے کھڑے کیے ہیں، کیونکہ ان کے بغیر زندگی ایک قدم نہیں چل سکتی۔ بخلاف ایسی ملحد یا مشرک قوموں کے، کائنات و حیات اور تاریخِ انسانی کے متعلق ہمارا شعور، پیغمبروں کے عطا کردہ علمِ وحی پر مبنی ہے جس کی صحت کا بڑا ٹسٹ یہ ہے کہ مختلف زمانوں اور حالات میں آنے والے تمام انبیا نے بنیادی حقیقتوں کا ایک ہی تصوّر دلایا ہے، اُن میں اختلاف نہیں پایا جاتا، پھر راستی اور امانت اور بے مُزد تعلیم و تلقین کے لحاظ سے بھی، اور انسانیت کی بھلائی کے لیے قربانیاں دینے کے لحاظ سے بھی جملہ انبیاء کی شخصیتیں ایسی درخشاں ہیں کہ ان کی بات پر ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں رہتا۔ اتنا ہی نہیں، جملہ کائنات کی جتنی آیات و مظاہر اور تاریخِ انسانی کے حوادث و واقعات، اُن کی تعلیمات کے فریم میں درست بیٹھتے ہیں۔ نیز کسی بھی دَور میں اُن کو تسلیم کرنے والے افراد کے کرداروں کی بلندی اُن کی صداقت پر ایک عظیم شہادت ہے۔

پس ہم ملّتِ اسلامیہ سے وابستہ لوگ کائنات و حیات کا خدا پرستانہ اعتقاد رکھتے ہیں، ہم تمام نظریات و افکار کی آخری کسوٹی علمِ وحی کو مانتے ہیں، ہم خدا کے رسولوں کے اسوہ کو انسانی کرداروں کے لیے معیار سمجھتے ہیں، ہم حق و باطل اور خیر و شر کی ایک خاص تقسیم کے قائل ہیں، ہم پائیدار اخلاقی بنیادوں کے مطابق انسانِ مطلوب کا خاکہ سامنے رکھتے ہیں، ہماری نگاہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی مراتب اور رابطوں اور باہمی حقوق و فرائض کا ایک متعین و مخصوص معاشرتی ڈھانچہ وقعت رکھتا ہے۔ ہم دولت و محنت کا تعاون عدل و احسان کے ذریعے قائم کرتے ہیں، ہم مرد و زن کے دو طرفہ مساویانہ حقوق کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے ادارے کو مستحکم رکھنے کے لیے مرد کو ادارے کی لیڈرشپ پر فائز کرتے ہیں، اسی طرح جنگ و صلح کے حدود، مجلسی آداب و شعائر، روایات و علامات اور ایک مخصوص قسم کا ذوقِ جمال و زیبائی ہمارے تہذیبی سرمایے کے لازمی اجزا ہیں۔ ہمارے اساسی عقائد کے مطابق جو خداپرستانہ تہذیب نمودار ہوتی ہے، اس میں ایک خاص نہج کی ہیئتِ اجتماعیہ جگہ پاسکتی ہے۔

اس تہذیبی نقشے کے مطابق حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معیاری معاشرہ قائم کیا، ایک مکمل ریاست کی تشکیل کی اور اس کی ضروریات کے مطابق موزوں ترین تعلیمی عمل کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں بخوبی چلتا رہا، یہاں تک کہ یہودی مجوسی سازش نے آخری تین خلفاء کو یکے بعد دیگرے شہید کیا اور ابتدائی مسلم معاشرے کو فتنہ و تفرقہ سے بھر دیا۔ رہی سہی کسر حادثۂ کربلا میں پوری کر دی۔ بعد کے ادوار میں جب سلطنت کا نقشہ بدل گیا، ملت کا نظامِ تعلیم علماء و مفکرین کے قبضے میں رہا۔ اور انہوں نے سلطنت کو اس میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ ملت کے علماء و مفکرین کے ذریعے چلنے والے آزاد نظامِ تعلیم نے بنیادی تہذیبی شعور کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرنے کا حق ادا کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یونانی افکار، عجمی تہذیب، تاتاری بربریت اور ہندی یوگیوں اور تیاگیوں کے تفلسف کے مختلف حملوں کے باوجود ملتِ اسلامیہ میں ہر مرحلے میں تجدیدی تحریکات اور احیائے اسلام کے جذبات کارفرما رہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سرزمینِ برصغیر پر بھی تحریکِ مجددیہ کے زیرِ اثر دورِ عالمگیری میں اسلامی نظامِ تہذیب بہت بڑی حد تک جلوہ گر ہوا۔

ہم پر مصیبت یہ آئی کہ ایک بیرونی قوم نے ہمیں غلامی میں جکڑ کر نظامِ تعلیم کے ذریعے اپنی مادہ پرستانہ تہذیب کو ہم پر ٹھونسنے کا عمل جاری رکھا۔ اس عرصے میں ہمارے عقیدے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے مقصد اور معیارِ انسان مطلوب، یعنی ہمارے اساسی تہذیبی شعور کو بڑی طرح تباہ کیا گیا۔ ہمارا پورا نیشنل ٹائپ غارت ہونے لگا۔ ہمارے امتیازی تہذیبی وجود کے تمام اجزا پراگندہ ہونے لگے، ہمارا تصورِ اجتماعیت نگاہوں سے گم ہونے لگا، اور ہماری ملی خودی جو تجدید و احیا کے لئے قوتِ محرکہ تھی، تعلیم کے تیزاب میں پڑ کر راکھ ہونے لگی۔ ہمیں اگر بچایا ہے تو قرآن و حدیث کے اُس علم نے جو ایک مشعل کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ رہا اور جس سے بہرہ مند کرنے کے لئے ہمارے اُن علماء، لیڈروں، ادیبوں، مصنفوں اور صحافیوں نے اپنی محنتیں صرف کیں جو مغربی سامراج کی غلامی کے قفس میں بھی اپنی ایمانی روح کو سلامت رکھ سکے۔

غلامی سے نکل کر ہم ایک دوسری آزمائش سے دوچار ہوگئے۔ وہ یہ کہ آزادی کے بعد بھی ہم اپنے نظامِ تعلیم کو اپنے تہذیبی شعور کا ذریعۂ انتقال نہ بنا سکے۔ بلکہ مخالفِ اسلام تہذیبی شعور کے ساتھ ہم نے اسلامیات کے ایک محدود مضمون کا جوڑ لگا دیا۔ اضداد کی اس پیوندکاری سے کچھ حاصل نہ ہوا۔

ایک کے بعد دوسری اور تیسری تعلیمی پالیسیاں بنتی آرہی ہیں۔ مگر تہذیبی نظریۂ تعلیم کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بات بن نہیں رہی۔ تازہ ترین تعلیمی پالیسی پچھلی کوششوں سے بہت بہتر ہے۔ مگر اس کا بھی مطلوب صرف یہ ہے کہ ہر مضمون میں اسلام کے عناصر کو شامل کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ مغرب سے مستعار علوم اور افکار اور نصابیات میں جو مادہ پرستانہ تصورِ کائنات و حیات، نظریۂ ارتقا کے تحت انسان کا جو حیوانی تصور، نفسیاتی اور تاریخی جبریت کا جو فلسفہ، اخلاق کا جو افادی نظریہ، ادب، سائنس اور ٹیکنولوجی کا جو دیوتائی مرتبہ، اور تحلیل و تحریم اور قانون سازی میں عوامی جذبات و خواہشات کی برتری کی جو فکر شامل ہے، اسے تبدیل کئے بغیر آخر یہ کیسے ممکن ہو گا کہ اس مقصد کی خدمت کے لئے وہ انسان پیدا ہوں جن کا تقاضا اسلام کا تہذیبی نظام کرتا ہے۔

ہمیں تو ایسی یونیورسٹیاں اور کالج درکار ہیں جن سے پڑھ کر نکلنے والے نوجوان اسلامی انقلاب کے سپاہی بن کر نکلیں۔ وہ اپنے دین اور اپنے نظریات و تصورات اور اپنی تہذیب کے اطوار و اقدار کی برتری کا یقین رکھتے ہوئے دنیا بھر کی اقوام کے سامنے ان کے نقیب بنیں۔ یہ اصل مطلوب اگر حاصل ہو تو علمِ ماحول اور علمِ اشیاء کا جو ذخیرہ جہاں سے بھی ملے از خود اپنی جگہ پہ نصب ہو جائے گا لیکن اگر تہذیبی شعور اور ملی خودی ہی زندہ و توانا نہ ہو تو آپ اس کی کمر سے اگر سائنس یا ٹیکنولوجی کی تلوار باندھ بھی دیں تو آخر بقاء ارتقا کا جہاد کیسے عمل میں آجائے گا۔

© rasailojaraid.com

خالی سائنس اور ٹیکنولوجی تو محض بے مقصد خدمت گزار فراہم کرتی ہے جنہیں کسی بھی قوم اور کسی بھی تہذیب کی گاڑی میں قلی بنا کر جوتا جا سکتا ہے۔

آج سے ہمیں فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہمارا مقصد محض اسلامیات پڑھانے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ خواہ اسے ہر مضمون میں شامل کر دیا جائے۔ بلکہ اسلامی نظام تعلیم وہ ہوگا جو غیر اسلامی اور مادہ پرستانہ تہذیبوں کے افکار و نظریات کے خلاف نوجوانوں کو ایمانی جہاد لڑنے کے قابل بنا سکے اور انہیں اسلام کے مکمل تہذیبی شعور سے مسلح کر سکے۔

حضرات! یہ ہے ملخص اس تہذیبی نظریۂ تعلیم کا جس پر میں مسلسل کاوش کرتا رہا ہوں۔ اور حسب عادت حوالوں کا سہارا لئے بغیر میں نے اپنی بات اپنے لفظوں میں بیان کر دی ہے۔

آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے ناچیز خیالات کو آپ نے تحمل سے سنا۔

(یہ مختصر مقالہ انجمن فاضلین (آئی۔ ای۔ آر) کی سالانہ کانفرنس (دسمبر ۱۹۶۸ء) میں پڑھا گیا۔)

© rasailojaraid.com